Title - MAULANA MOHAMMAD HUSSAIN AZAD.

Creator - Talib Allahabadi

Publisher - Lala Narain Lal (Allahabad).

Date - 1931

Pages - 48

Subjects - Sawaneh - Maulana Mohd. Hussain Azad ; Azad, Maulana Mohd. Hussain - Sawaneh - o - Tanqeed

نیشنل پریس اُردو اسٹوری ریڈرز

(۹)
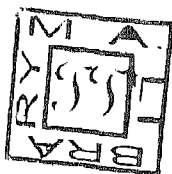
مولانا محمد حسین آزاد

مولفہ

طالب الہ آبادی

پبلشر

لالہ رام نراین لعل بکسیلر الہ آباد

سنہ ۱۹۳۱ء

راوّل

قیمت ۴ر

شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

باسمہٖ سبحانہٗ

پیدائش اور خاندان

سید محمد حسین آزاد جو اس وقت اُردو کے محسنین میں شمار کئے جاتے ہیں، جنکی نثر و نظم اُردو جاننے والوں کے ہر طبقہ میں مقبول ہے سنہ ۱۸۳۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، اُن کے والد مولوی محمد باقر صاحب کا گھر دہلی میں، کشمیری دروازہ پر بہرام خاں کی کھڑکی میں تھا ابتک وہاں اُن کا امام باڑہ موجود ہے۔ غدر میں یہ امام باڑہ بھی اور چیزوں کے ساتھ سرکار نے ضبط کر لیا تھا مگر آزاد کے صاحبزادے محمد ابراہیم صاحب نے اس کو واگذاشت کرا کے دوبارہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔

آزاد مغلوں کے معزز خاندان کی یادگار تھے۔ ان کی ماں ایرانی تھیں اسی لئے فارسی آزاد کے لئے مادری زبان اور گھر کی لونڈی تھی ہر وقت فارسی ہی کے چرچے رہا کرتے تھے مشہور ہے کہ بچپن میں جو بات یاد ہو جاتی ہے وہ بہت دنوں تک یاد رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ آزاد کی فارسی میں ایک خاص طور کی شیرینی

اور روانی تھی جو صرف اہل زبان کے یہاں پائی جاتی ہے۔
مولوی محمد باقر صاحب اپنے زمانہ کے عالم متبحر سمجھے جاتے تھے اور
شیعہ مذہب رکھتے تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

آزاد کی ابتدائی تعلیم دہلی کے اورینٹل کالج میں ہوئی یہ وہی کالج ہے
جہاں سے حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور ماسٹر پیارے لال آشوب ایسے
باکمال لوگ پڑھ پڑھ کر نکلے اور انھوں نے بھارت ماتا کے قدرتی
حسن و جمال میں چار چاند لگا دئے۔

اس کالج میں دینیات کی دو جماعتیں تھیں ایک شیعوں کی اور
ایک سنیوں کی پہلے تو آزاد شیعوں کی جماعت میں داخل ہوئے
اس کے بعد سنیوں کی جماعت میں پڑھتے رہے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ
ان کے یا ان کے والد کے اعتقادات میں کبھی کوئی فرق آیا ہو،
محمد باقر صاحب اور آزاد دونوں آخری سانس تک اپنے عقائد
کے لحاظ سے شیعہ رہے۔ سنیوں کی جماعت میں داخل ہونے
کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ شیعوں کی جماعت کو جو صاحب
پڑھاتے تھے ان کے طریقے محمد باقر صاحب کو پسند نہ تھے، دوسری

اور اصلی وجہ یہ تھی کہ باپ بیٹے دونوں انتہا سے زیادہ بے تعصب تھے۔ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ اُن کو تو آم کھانے سے مطلب تھا پیڑ گننے سے نہ تھا۔ اور تیسری وجہ یہ تھی کہ جبتک آزاد یا کوئی شخص مختلف مذاہب کا مطالعہ نہ کرلے اُس کو خود اپنے کیش و مشرب کی پوری قدر و اہمیت معلوم ہی نہیں ہو سکتی۔

مولوی محمد باقر صاحب نے تحصیلداری سے پنشن لینے کے بعد "اُردو" کے نام سے ۱۸۳۷ء میں اُردو زبان کا سب سے پہلا اخبار دہلی سے جاری کیا تھا، آزاد نے اپنے بچپنے میں بہت کچھ سرمایہ اِس اخبار سے حاصل کیا۔ آزاد کی طبیعت قدرتاً موزوں تھی وہ بلا کے ذکی اور ذہین تھے۔ انشا پردازی کا چسکہ اُن کو کالج کی دیواروں کے اندر ہی پڑ چکا تھا اپنی جماعت میں ہمیشہ سب سے اچھے رہتے تھے۔ دیوان ذوق اور دیباچۂ آبحیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق نے آزاد کی طبع رسا اور ذہن خداداد کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ آزاد ذوق کے سب سے زیادہ ہونہار اور چہیتے شاگرد تھے۔ ذوق کو آزاد سے بڑی بڑی اُمیدیں تھیں اور آزاد نے اُن اُمیدوں کو بہت حد تک پورا بھی کیا۔

آزاد کو طالب علمی ہی کے زمانہ میں اپنے اُستاد کے اشعار

اپنی بیاض میں لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے علاوہ وہ ذوق کا کلام جہاں کہیں سے پاتے تھے صندوق سینہ اور خزانہ سفینہ میں محفوظ کرتے جاتے تھے۔ ان سے زیادہ اور تو اور خود ذوق کے پاس اُن کے کلام کا مجموعہ نہ تھا۔ افسوس ایسا بیش بہا خزانہ طوفان غدر کے نذر ہو گیا۔

آزاد کی تربیت اُن کی ایرانی النسل اور تعلیم یافتہ ماں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اِن کا لب ولہجہ بالکل ایرانیوں کی طرح تھا۔ اور تحریر میں بھی اہل زبان کی شان تھی ایرانی سوداگر اکثر انھیں کے مکان پر آکر رہا کرتے تھے اُن سے بحث و گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اسی لئے آزاد کی فارسی محض کتابی اور اکتسابی فارسی نہ تھی بلکہ اُن کی زبان پر نئے نئے محاورات اور خاص مواقع کی باتیں ہمیشہ رہا کرتی تھیں آج درسی زبان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ جدید فارسی کا دَور دَورہ ہو رہا ہے۔ اس دَورِ جدید میں ترکی الفاظ و محاورات اور گفتگو کے فقرے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بناوٹ کی جگہ سادگی اور مشکل پسندی کی جگہ سہل نگاری ہے، جدید فارسی کے رواج دینے والوں میں سب سے پہلی ہستی آزاد کی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کو زندہ فارسی سکھائی اور بتادیا کہ زبان فارسی میں جو انقلاب

شروع ہوگیا ہے وہ بہت جلد ایک مکمل صورت اختیار کرلیگا،
آزاد کو عربی میں بھی دستگاہ تھی۔ عروض، فقہ، تاریخ، ہئیت اور
دوسرے مشرقی علوم کے سرچشمہ سے انھوں نے اپنی پیاس بجھائی
تھی۔ بھاشا، ہندی اور انگریزی سے بقدر ضرورت واقف تھے،
یہی وجہ ہے کہ اُردو نظم و نثر پر جو احسان انھوں نے کئے ہیں وہ
آج تک کسی ایک کا حصہ نہیں ہوئے۔

وہ فطرتاً ذہین اور طباع تھے، بال کی کھال نکالا کرتے تھے،
اور جو کہنا چاہتے تو وہ تقریر اور تحریر میں اس خوبی سے ادا کر جاتے
تھے کہ پڑھنے اور سُننے والے محظوظ و مسرور ہو جاتے تھے۔

ظاہری محاسن

آزاد ظاہری محاسن کے اعتبار سے وجیہ اور حسین نہ تھے،
میانہ کیا پستہ قد آدمی تھے رنگ بھی گندمی تھا اور جسم بھی چھریرا تھا
مگر تصویر خود کہے دیتی ہے کہ پیشانی صفائے باطن کا آئینہ ہے اور
نگاہوں سے متانت، رُعب اور نور کی بارش ہوتی ہے آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر دیکھئے تو بے ساختہ عزت اور محبت کرنے کو
جی چاہتا ہے۔

لباس

مزاج کی طرح لباس بھی ہمیشہ سادہ رہا۔ وضعدار آدمی تھے۔ دہلی کے رؤساء اور شرفا کی پوشش پسند تھی لٹھے کا ڈھیلا ڈھالا اچکن پہنتے تھے۔ سر پر ہندوستانی وضع کا مولویانہ عمامہ باندھا کرتے تھے۔ چہرے سے ذہانت و ذکاوت ٹپکتی تھی بشرہ سے کشادہ پیشانی۔ ہنس مکھ نکتہ رس ہمدرد اور رحمدل معلوم ہوتے تھے۔

مزاج

اُن کی تقریر میں ایسا جادو تھا اور الفاظ میں وہ موہنی تھی کہ جو شخص آپکی محفل سے اُٹھا بشاش اُٹھا اور کچھ حاصل کرکے اُٹھا۔ باتیں کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے ذہانت اور ذکاوت ہونٹھ چومتی تھی۔ باتوں باتوں میں ہنسا دینا، رُلا دینا اور نصیحت کے انمول موتی بکھیر دینا انھیں کا کام تھا۔ لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ محض دل لگی کی باتیں اور دل بہلانے کی حکایتیں ہیں حالانکہ وہ بے خبر تھے اور آزاد کا لفظ لفظ اُن کے ذہنی اور دماغی

قواء کو چلا دیتا جاتا تھا یہی بات اُنکی تحریروں میں بھی پائی جاتی ہے
بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت معمولی کہانیاں سنائی جا رہی
ہیں اور باغ سخن کی دلفریب روشیں دکھائی جا رہی ہیں مگر
مخاطب اور ناظر کے دل و دماغ برابر ایک نامعلوم انداز سے
فیضیاب ہوتے جاتے ہیں۔

آج کل، عام طور پر اسکول اور کالج کے طلباء اور مدرسین
میں عقیدت و شفقت بہت کم پائی جاتی ہے مگر صدہا نوجوان
جنھوں نے اپنی خوش قسمتی سے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا
ہے وہ جانتے ہیں کہ جو شفقت فلاطون ارسطو پر تفتہ مرزا غالب
پر اور شیفتہ مومن خاں پر کرتے تھے وہی شفقت مولانا اپنے تمام
شاگردوں پر کیا کرتے تھے۔ اکثر شاگردوں کو فراغت تحصیل
کے بعد حصول معیشت میں آنھوں نے مالی، قلمی اور ہر طرح
کی امداد دی۔

آزادی

آزاد واقعی اپنے نام کی زندہ تصویر تھے ہمیشہ چمنستان
کلام و حیات میں انکی زندگی سرو آزاد کی طرح بسر ہوئی۔ نہ وہ

کسی دربار کے مدح خواں تھے نہ کسی خاص جماعت کے ارگن،
وہ ہمیشہ ظاہری نمود و نمائش سے الگ تھلگ رہے۔ قوم و ملک
کی اصلاح کے لئے آنھوں نے اپنی سعی کبھی اُٹھا نہیں رکھی مگر
نام نہاد لیڈری سے اپنا دامن کبھی میلا ہونے نہیں دیا۔
وہ ایسی کسی ملکی جماعت کے کارکن یا رکن یا حامی یا مخالف
نہیں رہے جس کا تعلق کسی خاص ایسوسی ایشن یا کانفرنس یا
تحریکات سے رہا ہو۔

شہرت و مقبولیت

آزاد نظم و نثر پر ایک حیثیت سے قادر ہیں۔ اردو جاننے
والوں اور پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی جماعت ایسی ہو جو
اُنکی تصانیف کو دلچسپی سے نہ پڑھے۔ ابتدائی درجوں میں تعلیم
پانے والے لڑکوں سے لیکر ایم اے اور ڈاکٹری کی ڈگریاں رکھنے والے
سب اپنی استعداد کے موافق اُنکی تحریر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔
کوئی کتاب اُٹھا لیجئے دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ختم کے بغیر چین نہیں ملتا۔
قلم اُن کے ہاتھ میں چوب اور کاغذ نقارہ تھا جس نے اُن کی شہرت کا
آوازہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہونچا دیا اُنکی شہرت کسی سوشل

پلیٹ فارم یا قومی مجلس سے نہیں ہوئی بلکہ
جو سچی روشنی ہے پھوٹ کر نکلے گی پردوں سے
تجلیِ حقیقت رہ نہیں سکتی نہاں ہو کر

بے تعصبی

وہ ہر قسم کے قومی، مذہبی، مقامی، فرقہ وارانہ، علمی، تمدنی، اور معاشرتی تعصب سے بالکل پاک صاف تھے۔ جس طرح منصف مزاج بادشاہ اور سچا حکمراں اپنے ہر مذہب و ملت کی رعایا کو ایک ہی نگاہ پدری سے دیکھتا ہے اور آس پاس کے دوسرے بادشاہوں سے برابر کا برتاؤ کرتا ہے۔ یہی حالت ملک سخن کے اس شاہنشاہ کی بھی تھی۔ صلح کل آپ کے خمیر میں تھا عالی دماغی اور پاک باطنی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی آج کل، رسائل و اخبارات تصنیفات و تالیفات سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ موجودہ ناظم اور نثار بری طرح اپنوں سے اور عزیزوں سے برابر والوں سے اور پست و بلند درجہ والوں سے بے کار، بے اصول اور بے مزہ طور پر الجھتے رہتے ہیں کاش وہ آزاد کی حیات و تصانیف سے بے تعصبی کا سبق حاصل کریں۔ کمال علم و ہنر اور ترقی ذہن و دماغ کا آخری اور

اصلی درجہ وہی ہے جہاں پہونچ کر دیر و حرم - گبر و ترسا - ہندو و مسلم
واعظ و برہمن، مشرقی اور مغربی کے تمام جزئی اور چھوٹے چھوٹے
اختلافات نگاہوں سے گر جاتے ہیں جہاں پہونچکر مصنف یا شاعر
ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں گرد و غبار کدورت و کثافت کا
نام نہیں رہ جاتا اور جس میں ہر مذہب و ملت بلکہ ہر ہستی
اپنی اصلی اور حقیقی تصویر کا عکس صاف صاف دیکھ لیتی ہے -
ان کی اکثر تصانیف میں قدم قدم پہ بے تعصبی کے جلوے نظر
آتے ہیں۔ بیشتر "نگ خیال، دربار اکبری اور قصص ہند میں بے شمار
موقعوں پر عالی نفسی اور بلند خیالی کے جیتے جاگتے مرقع ہیں - ذیل کے
فقرات سے جو نمونتاً لکھے جاتے ہیں اس "شہروار" کا پتہ آسانی سے
چل جائیگا جو ہر شخص محنت اور خلوص سے پا سکتا ہے ——

قصص ہند میں رانی پدمنی کے باب کی ابتدا یوں
ہوئی ہے -

"رانی نے جوہر کر کے خاندان کی آن پہ جان
قربان کی"

(۱) اس فقرے سے صاف ظاہر ہے کہ جوہر کی مقدس رسم
کی قدر آنکی نگاہوں میں کیا تھی -

(۳) اور سادگی سے قطع نظر "دان" "آن" "جان" "قربان" میں "ن" کی پیاری آواز بڑی دلفریب ہے۔

اب ذرا شہادت نامہ کا حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

"سب سے آگے دانا اور پیچھے تمام جاں نثار جس میں سپاہی اور سردار سب برابر ہو رہے تھے قلعے سے باگیں اٹھائے نکلے اور ان گنتی کی جانوں کو گٹھری کر کے لشکر شاہی کے دریا میں دے مارا اگرچہ دیکھنے والوں کے نزدیک ان کی وہ حالت ہوئی کہ کوئی ایک مٹھی خاک کی طوفان نوح میں پھینک دے مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ جب تک چاند سورج باقی ہیں ان مردوں کے نام آسمان مردانگی پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں گے" ان دو فقروں میں شکوہ فوج، شان حملہ، کثرت مخالفین اور حالت جرأت سب کی داستانیں مختصر اور سادہ الفاظ میں یہاں کی گئی ہیں۔ دریا کو کوزے میں بند کر دینا اور اس کے کیفیت اثرات روانی، شور، طوفان، سکوت، ہیبت و لطافت کا قائم رکھنا اگر معانی و الفاظ پر پوری قدرت نہیں ہے تو کیا ہے۔

- ماہتابی جشن" "پرتھی راج کا جلوس" دکن کی لڑائی پر

عالمگیر کے لشکر کی چڑھائی" اور بہت سے باب قصص ہند میں ایسے ہیں جن سے ان کی بے تعصبی کا پتہ صاف صاف چلتا ہے وہ اپنی تصنیف کی ہر ہستی کو جس درجہ کا سمجھتے ہیں وہی رتبہ اُس کو دیتے ہیں چاہے وہ کوئی ہو، ایک مضمون کا اقتباس اور دیتا ہوں جس سے اُن کے پاکیزہ خیالات اور خالص جذبات کا پتہ بہت آسانی سے چلے گا۔

"میرے اہل وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے ایک ہندو ایک مسلمان تم جانتے ہو کہ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے اگر بھاشا ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب سے فائق ہے سنسکرت کی قوت نظم خود حد بیان سے باہر ہے اے خاک ہندوستان! اگر تجھ میں امراءالقیس اور متنبی نہیں تو کالیداس بھی نکال اے ہندوستان کے صحرا و دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو والمیک ہی پیدا کر دو"

اس کے علاوہ نیرنگ خیال کے بعض مقالات اور دیباچۂ آبحیات کے بعض اجزاء انہیں خیالات سے بھرے ہوئے ہیں۔

غدر اور آزاد

۱۸۵۷ء کا غدر مشہور ہے۔ بعض بوڑھے آدمی جنھوں نے غدر کے ہنگامے دیکھے ہیں ابتک زندہ ہیں اور اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی باتیں بیان کرتے ہیں، ہند کی تاریخیں (جو ہندی اردو اور انگریزی میں لکھی ہیں) غدر کی کہانیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

غدر کے طوفان میں وہ زور و شور تھا کہ نفسی نفسی پڑی ہوئی تھی، باپ کو بیٹے کی، شوہر کو بیوی کی اور ماں کو لڑکوں کی خبر نہ تھی۔ جس کا جدھر منھ اٹھ جاتا بھاگ نکلتا تھا شور و فساد کی آگ دم بدم بھڑکتی جاتی تھی۔

مولوی محمد باقر صاحب رئیس بھی تھے۔ عالم بھی تھے ہر دل عزیز بھی تھے۔ غدر میں ان پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ مگر قسمت کا پانسہ پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ دنیا میں پلک جھپکتے انقلاب ہو جاتا ہے۔ دیکھو کیسی عبرت ناک سبق آموز اور دلدوز کہانی لکھی جاتی ہے

غدر کے زمانہ میں انگریزوں پر آئے دن نت نئی مصیبت نازل ہوتی رہتی تھی۔ لوٹ مار کی گرم بازاری تھی کسی انگریز کی جان اور آبرو محفوظ نہ تھی، من دھن پران سب کھٹکے میں رہتے تھے ٹیلر صاحب جو نسلاً انگریز تھے اور غدر کے پہلے دہلی کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے انھوں نے مولوی صاحب سے اُردو فارسی پڑھی تھی۔ غدر کے زمانہ میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے اُستاد کے پاس آئے۔ مولوی صاحب پر اُن کو پورا بھروسہ تھا سمجھے اور ٹھیک سمجھے کہ مولوی صاحب کے گھر سے زیادہ اور کسی مقام پر وہ اس قدر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وقت بہت نازک تھا ہندو مسلمان دونوں انگریزوں کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے تین دن تک۔ ٹیلر صاحب کو اپنے مکان میں کیا اپنے سایۂ عاطفت میں چھپا رکھا مگر ہر منٹ یہی اندیشہ تھا کہ جاہل باغیوں کو پتہ لگ جائے گا تو آفت ہو جائے گی۔

آخر وہ وقت تین دن کے بعد آ ہی گیا۔ ہوا نے غمازی کی یا محلہ والوں کی سرگوشیوں سے بھنک آڑی جو کچھ بھی ہوا ہو باغیوں کو ٹیلر صاحب کا پتہ چل گیا وہ آئے مکان کو گھیر لیا اور دھمکیاں دینے لگے جاہل باغیوں کو اپنی کثرت پر گھمنڈ تھا کہنے لگے۔

"خیریت اسی میں ہے کہ مولوی صاحب ٹیلر کو ہمیں دیدیں نہیں تو ہم گھر میں گھس کر لوٹ مار کریں گے آگ لگادیں گے۔ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔

مولوی صاحب کو یہ سب منظور تھا مگر وہ اپنے مہمان کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ جب ٹیلر صاحب نے یہ حالت دیکھی کہ صرف ایک میرے لئے مولوی صاحب کا گھر کا گھر تباہ ہوا چاہتا ہے تو شرافت نفس اور پاکیزگی ضمیر کو جوش ہوا۔ اپنے استاد سے ضد اور اصرار کر کے خود ہی باہر نکل آئے۔ باہر آنے کے پہلے انہوں نے مولوی صاحب کو اظہار تشکر میں ایک لاکھ پچھتر ہزار کے نوٹ نذر کئے خیال یہ آیا کہ دنیا کی دکان میں بے اعتباری اور بدگمانی بہت سستی ہے کہیں مولوی صاحب پر کوئی شبہ نہ ہو لہٰذا اپنے دست و قلم کی ایک دستخطی تحریر بھی اس مضمون کی لکھدی کہ میں نے یہ رقم اپنی خوشی و رضامندی سے مولوی صاحب کے نذر کی ہے۔ آئی بات گئی بات۔ ٹیلر صاحب باہر نکلے۔ باغیوں میں پہلے ہی سے جہالت کا جوش موجود تھا۔ ٹیلر صاحب کی صورت دیکھتے ہی آپے سے باہر ہوگئے اور کچھ نہ دیکھا کر اس بے گناہ کو قتل کر ڈالا۔

جب غدر کی آگ فرو ہوئی تو مولوی صاحب اپنی انتہائی پاک باطنی، وضعداری، معاملہ فہمی، شرافت نفسی اور صدق گوئی کی وجہ سے ہڈسن صاحب کے پاس تمام نوٹ اور تحریریں لے کر گئے۔ ابھی ٹیلر صاحب کی داستان پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ہڈسن صاحب کو بدگمانی ہو گئی پوچھا کہ ول ٹیلر صاحب کہاں ہے؟ مولوی صاحب نے سچا جواب بے تکلف اور بے ساختہ دیدیا کہ مارے گئے۔ یہ سننا تھا کہ ہڈسن صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مثل مشہور ہے کہ غصہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ ہڈسن صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بات پوچھی نہ کہانی سنی، تحریر دیکھی نہ دستخط کی عزت کی فوراً حکم دیا کہ گولی مار دو۔ حکم کی دیر تھی ہوا میں ایک سناٹا ہوا، تڑاقے کی آواز آئی اور مولوی صاحب، بے گناہ مولوی صاحب، شریف باطن مولوی صاحب، راست گو مولوی صاحب، معصوم مولوی صاحب اپنے خاک و خون میں بے بسی سے تڑپنے لگے۔

ہڈسن صاحب کے نزدیک وہ کئی جرائم کے مرتکب تھے۔

(۱) ۱۸۵۶ء میں مولوی صاحب نے سیاسی رنگ کا پہلا اُردو اخبار دہلی سے جاری کیا تھا جس کے مدیر وہ خود تھے اور

جنہیں اُن کے بقول انگریزوں کے خلاف بہت سخت مضامین لکھے جاتے تھے۔
(۲) یہ کہ وہ ٹیلر صاحب کے قاتل تھے۔
(۳) ٹیلر صاحب کی تحریر سچی نہ تھی دستخط بھی جھوٹا تھا۔

اس روح فرسا حادثہ کے بعد مولوی صاحب کی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائداد ضبط کرلی گئی۔ اُردو اخبار کا ایک ایک پرچہ ضبط کرکے بحق سلطنت جلوادیا گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے بفرض محال مولوی صاحب کو مجرم بھی سمجھ لیجئے تو بے بس عورتوں اور بے گناہ بچوں کا کوئی قصور معلوم نہیں ہوتا۔ سچ ہے انتقام کی آگ بری ہوتی ہے۔

علم دوستی

اُس وقت آزاد کی عمر ۲۶ یا ۲۷ سال کی تھی۔ جوانی کے دن تھے، سارا بچپن بے فکری اور آسایش میں بسر ہوا تھا یکایک سر پر یہ پہاڑ پھٹ پڑا۔ سرکاری سپاہی بندوقیں لئے سنگینیں چڑھائے گھر میں گھسے ہوئے تھے، سجا سجایا مکان آنکھوں کے سامنے تھا ماں بہنیں اپنے اپنے بچوں کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ جلاوطن ہونے کا سامان ہورہا تھا۔ وہ عورتیں جنھوں نے کبھی دھلیز کے باہر پاؤں نہیں رکھا تھا اُن کو اکبارگی گھر چھوڑ کر نکلنا تھا پھر یہ معلوم نہ تھا کہ

کہاں جانا ہے کیسے جانا ہے اور کب پہونچیں گے۔ ایسی حالت تھی کہ ذرا سا تصور کیجئے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آزاد نے کوئی قیمتی سامان نہیں لیا۔ نقدی اور جواہر کی پروا نہیں کی۔ اپنے اُستاد ذوق کا جو کلام اس پریشانی میں ہاتھ لگا" بغل میں مارا" اور چل کھڑے ہوئے۔

غدر کے بعد

آزاد اس بے کسی سے پھرتے پھراتے لکھنؤ پہونچے۔ تھوڑے دنوں ایک فوجی اسکول میں معلم بھی مقرر ہوئے مگر بدقسمتی پاؤں کا چکر بنی ہوئی تھی۔ وہاں بھی جم کر نہ رہ سکے۔ کچھ دنوں ریاستِ جھنڈ میں بسر کی مرثیہ، سلام، نوحہ، رباعیات وغیرہ اس زمانے کی ہیں، اور ۱۸۶۴ء میں حیدرآباد سے واپس آکر لاہور پہونچے۔ مولوی رجب علی صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ انھوں نے آزاد کو من پھول سے ملوایا جو لفٹنٹ گورنر کے میر منشی تھے اُن کی سفارش سے آزاد کو محکمہ تعلیم میں پندرہ روپیہ کی جگہ مِل گئی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب یکے بعد دیگرے رائے بہادر ماسٹر پیارے لال، منشی درگا پرشاد نادر، مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، مولوی کریم الدین۔

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی "اُجڑے دیار" کو چھوڑ کر
لاہور آ گئے تھے خوب خوب صحبتیں رہا کرتی تھیں۔

اس زمانے میں میجر فلر صاحب محکمۂ تعلیم کے ناظم تھے۔ نہایت
علم دوست شخص تھے، مشرقی زبانوں سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔
اکثر علمی باتوں میں منشی رجب علی اور رائے بہادر ماسٹر پیارے
لال صاحب سے تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے اور صاحبان علم کے
بڑے قدردان تھے۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں ماسٹر صاحب سے
لفظ ایجاد کے متعلق گفتگو ہوئی کہ مذکر ہے یا مؤنث۔ ماسٹر صاحب نے کہا
مذکر ہے اس پر صاحب نے فرمایا کہ ہمارا سرشتہ دار مؤنث
بتاتا ہے۔ ماسٹر صاحب نے دیکھا کہ حسنِ اتفاق سے ایک پہلو نکل
آیا ہے۔ موقعہ کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے کہنے لگے، آپ کے دفتر
میں دہلی کے رہنے والے آزاد موجود ہیں بہت ہوشیار ہیں آپ
اُن سے مشورہ کیوں نہیں کرتے؟ اہل زبان ہیں محقق ہیں فلر صاحب
نے آزاد کی ذہانت و ذکاوت قابلیت اور تبحر کی شہرت سن کر
ایک روز طلب فرمایا اور ایجاد کے متعلق رائے لی۔ آزاد نے بیساختہ
کہہ دیا کہ ایجاد مذکر ہے اور سند و شاہد کی حیثیت سے سودا کا ایک
مصرعہ پیش کیا ع ہائے یہ کس ... وے کا ایجاد ہے۔

نکتہ سنج نگاہوں کے لیے یہی بہت تھا آزاد کے دن پھر چکے تھے
اُن کی وقعت اور ترقی میں پر لگ گئے۔ سب سے پہلے اُن سے
فرمایش کی گئی کہ مدارس پنجاب کی ابتدائی جماعتوں کے لیے آسان
آسان کتابیں تصنیف و تالیف کریں۔ فارسی کی پہلی اور دوسری
اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور قصص ہند کا حصہ دوئم
(پہلا اور تیسرا حصہ پیارے لال صاحب کا ہے) طلبا کے لیے بہت
مفید و مقبول ثابت ہوئے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ آزاد نے پنجاب کی اشاعت
تعلیم میں بہت قابل قدر حصّہ لیا اور اُن کی تصنیف و تالیف ابتدائی
درجوں کے لیے بہت معاون ہوئیں۔

پنجاب کا تمام صوبہ اُردو کی واقفیت کے لیے خاص طور پر
ان کا ممنون ہے یہ کہنا خلاف واقعہ ہے مگر پنجاب کی جو کچھ خدمات
انھوں نے اپنی اُردو تصنیفات سے کیں اُس وقت
اُن کی ضرورت تھی۔

آزاد کی سیاحی اور فارسی

آزاد سب سے پہلے ۱۸۶۵ء میں سرکاری کام سے کلکتہ گئے،

جب پنڈت من پھول کابل و بدخشاں گئے تو آزاد کو بھی اپنا رفیق طریق بنا کر لے گئے۔

آزاد نے ایران کا دو مرتبہ سفر کیا اور دونوں سفر سیاسی اغراض پہ مبنی تھے، پہلا سفر ۱۸۶۵ء میں کیا تھا اور دوسرا سفر ۱۸۸۳ء میں کیا تھا۔ ان دونوں سفروں سے اُن کی فارسی میں چار چاند لگ گئے۔ خالص فارسی ایران اور اہل ایران یعنی مرکز زبان اور اہل زبان سے سیکھ لی۔ درسی اور قدیم فارسی کی تکمیل یہیں ہو چکی تھی، سیاحت سے جدید فارسی کا خزانہ بھی جمع کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُنکی تصنیفات سے "زندہ فارسی" سیکھتے ہیں۔ ایران کا روزمرہ تاتار اور بدخشاں، طہران اور مشہد کی مروجہ زبان کی تعلیم ہندوستان میں سب سے پہلے ہم کو انہیں سے ملی۔ ان کو زبان کی تحقیق کا بہت شوق تھا۔ ذیل کے ایک لطیفہ سے موصوف کی تلاش دلچسپی اور قدر کی حقیقت کھلتی ہے (آزاد مرحوم صفحہ ۸ و ۹)

دوسری مرتبہ مولانا آزاد جب ایران کے سفر سے واپس آئے تو ایک بےشمار نوٹوں، مسودہ یادداشت اور تحقیقات کا اپنے ساتھ لائے ۱۸۸۶ء کے قریب کا ذکر ہے کہ وہ کتب خانہ

آزاد کی عمارت تعمیر کرا رہے تھے۔ ایک کمرہ بن چکا تھا اور فرطِ اشتیاق سے اس میں چند الماریوں کی ترتیب اور خانہ پری میں مصروف تھے۔ راقم ان دنوں لاہور گیا ہوا تھا اور آپ کی صحبت سے اکثر فیضیاب ہوا کرتا تھا اتفاق سے محاورہ کی صحت استعمال کا ذکر چھڑ گیا فرمانے لگے کہ ایک غیر زبان کے محاورہ کو صحیح اور باموقع استعمال کرنا بہت مشکل ہے اور یہ دلچسپ روایت بیان کی کہ ایک دن ایران میں میں ایک گھر میں مہمان تھا۔ کھانا پک رہا تھا۔ ماں دس بارہ برس کی لڑکی کو چولہے کے پاس چھوڑ کر آپ اندر کے دالان میں کوئی کام کرنے گئی اور لڑکی سے کہتی گئی کہ دیگچی کا خیال رکھے کہ کھانا جوش کھا کر باہر نہ گر پڑے۔ رفتہ رفتہ آنچ تیز ہوتی گئی اب میں نے سوچا کہ چاول اُبل کر باہر نکل پڑیں گے دیکھوں تو اس کیفیت کو یہ لڑکی کن الفاظ میں ظاہر کرتی ہے۔ اور فرمایا کہ میں اپنی فارسی کی لغت اور زباندانی کے دفتروں کو اپنے ذہن میں دُہراتا تھا اور اس خیالی کیفیت کے مختلف اظہار گڑھتا تھا کہ شاید یہ کہے گی یہ کہے گی کہ وہ وقت آپہونچا اور میرے تمام خیالی دفتر خیالی پلاؤ ثابت ہوئے جوں ہی دیگچی

کے جوش کھانے سے اس کا ڈھکنا ایک طرف سے ایک آدھ
انچ اوپر کو اُٹھا کہ لڑکی چیخ اُٹھی -

"دیگچہ سر کردہ"

یہ لفظ گویا میرے کانوں میں الہامی کلمہ کی طرح پڑے
اور میری آنکھیں کھُل گئیں - جس شخص کو زباندانی کا یہاں تک
مذاق ہو جو شخص اس قدر نکتہ رس اور صاحب تلاش ہو جس نے
غیر زبانوں کی تحقیق میں اس درجہ کاوش اور کوشش کی ہو وہ
خود اپنی زبان میں کیا کچھ نہ کر دکھاتا اور حق الامر یہ ہے کہ اُردو
میں آزاد نے وہ کچھ کر دکھایا جس کی ان جیسے آدمی سے توقع
کی جاسکتی تھی - اُن کی تصانیف کے بغیر دہلی بغیر قلعہ کے اور
لال قلعہ بغیر دیوان خاص کے اور مثمن برج کے ہوتا مگر زمانہ
کو یہ منظور نہ تھا اس لئے اُنکو موتی لے کر اپنے سینے کے خزانے
سفینوں کے سپرد کریں "

آزاد اور صحافت

میجر فلر کے بعد کرنیل ہالرایڈ (Colonel Holroyd)
صاحب محکمۂ فوج سے تبدیل ہو کر تعلیمات کے ناظم مقرر ہوئے کرنیل
موصوف کی فرمائشوں سے بھی آزاد نے بہت کچھ لکھا جس کی عوام کو خبر

بھی نہیں ہے۔
۱۸۷۰ء میں کرنیل صاحب کو خیال ہوا کہ جو اُردو اخبار ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کی سرپرستی میں لاہور سے شایع ہوتا تھا اس کو ترقی دی جائے۔ نگاہ انتخاب میں ماسٹر پیارے لال آشوب اور محمد حسین آزاد آگئے۔ آشوب صاحب نے عنان ادرات سنبھالی آزاد صاحب بھی معین و رفیق کی حیثیت سے ہم عنان ہوگئے ان دو تجربہ کار اور سحر نگار ناظمین کے آتے ہی اخبار میں نئی روح دوڑ گئی۔ دونوں زمانہ کے نباض تھے اور دونوں کی طرز تحریر ہر دلعزیز تھی سال ہی دو سال میں ایسا رنگ جما کہ اور تمام مقامی اخبار گمنامی کی دنیا میں جا رہے۔ غیر سرکاری اور دیگر مدیروں نے غل مچانا شروع کیا آخر وہ اخبار بند کر دیا گیا اور اس کی جگہ دوسرا رسالہ "اتالیق" کے نام سے نکالا گیا اس رسالہ کے ایڈیٹر آشوب صاحب رہے آزاد سب ایڈیٹر (نائب مدیر) کے فرائض انجام دیتے تھے۔ رسالہ کا اصل مقصد جو نام سے ظاہر ہے یہ تھا کہ یورپ اور ایشیا کے علوم کی نشر و اشاعت اعلیٰ درجہ کے مفید مضامین سے کی جائے۔ اس وقت مولانا آزاد کو پچھتر روپیہ ماہوار

ملتے تھے۔ یہ وہی اخبار ہے جس کی سب ایڈیٹری کچھ دنوں آزاد کے بعد حالی نے بھی کی ہے۔

ملازمت اور اعزاز

سررشتۂ تعلیم میں ملازمت کی تفصیل پچھلے صفحات میں درج ہے جب دوسری بار حضرت آزاد سفر ایران سے واپس آئے تو گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور جب تک صحیح الدماغ رہے اس عہدہ پر ممتاز رہے۔ ان کو پولیٹیکل خدمات کے عوض میں جو انھوں نے افغانستان، تاتار اور ایران میں انجام دیں کوئی علیحدہ پنشن یا انعام نہیں ملا جو پنشن انکو ملتی تھی سررشتۂ تعلیم اور گورنمنٹ کالج کی خدمات کے عوض ملتی تھی یعنی پچیس روپیہ ماہوار پاتے تھے۔

۱۸۸۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کی یادگار جوبلی کے موقعہ پر مولانا کو ان کی ادبی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ جس کے وہ اہل تھے اور جو ان کو محض ان کی خالص اور مفید خدمات کے عوض حاصل ہوا تھا۔

خلل دماغ

بعض لوگوں کی تحقیق ہے جسمیں ذکاء اللہ صاحب بھی شامل ہیں
کہ مولانا کے حواس میں ۱۸۸۷ء سے خلل واقع ہوا بعض جن میں ماسٹر
پیارے لال صاحب ایسے محرم راز اور مستند شخص داخل ہیں کہتے
ہیں کہ ۱۸۹۱ء میں یہ روح فرسا مرض لاحق ہوا۔ دونوں جماعتوں
میں صرف چار سال کا فرق ہے اور مجھ کو دونوں باتیں صحیح معلوم
ہوتی ہیں پہلی اس لئے کہ جنون یا خلل دماغ کے مدارج ہوا
کرتے ہیں ابتدائی دورے بہت سخت نہیں ہوتے نہ دیر تک
قائم رہتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ ۱۸۸۷ء سے یہ مرض شروع
ہو گیا ہو اور اس نے مستقل صورت ۱۸۹۱ء میں اختیار کی ہو
دوسری روایت بھی قرین قیاس ہے اس لئے کہ ۱۸۸۷ء میں مولانا
نے ایک نظم پڑھی تھی ۱۸۸۸ء میں کتب خانے کی بنیاد ڈالی
تھی اور دیوان ذوق کی نظر ثانی کی تھی اور ۱۸۸۹ء میں خطاب
سے سرفراز ہوئے تھے۔ خلل دماغ کے وجود کے لئے بعض
قیاسات یہ ہیں۔

(۱) ان کی صحت دور دراز کے سفر کی متحمل نہیں ہو سکی

اُس زمانہ کا سفر آج کی طرح آسان نہ تھا۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ٹریموے کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا لہٰذا رفتہ رفتہ آپکی صحت میں فرق آتا گیا۔

(۲) غدر کے بعد سے ۱۸۸۸ء تک بیس برس مولانا نے انتہائی جوش و خلوص کے ساتھ مسلسل طور پر دماغی کام کیئے جس کے اثرات خرابی صحت میں معین ہوئے۔

(۳) مولانا کی ایک چہیتی اور پیاری لڑکی تھی جس کو وہ بہت چاہتے تھے اور ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دے رکھی تھی کہ وہ اِن کے مسودوں کی نقل اور تصانیف کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ اُس کی جان فرسا موت نے مولانا کو کہیں کا نہ رکھا اور غم والم نے خرابی صحت کے ساتھ ساز باز کرکے مجنون کردیا۔ رفتہ رفتہ یہ مرض پختہ ہوگیا اور آخری سانس تک مولانا سے جدا نہیں ہوا۔

عالم جنون میں بھی صفائے باطن کی وجہ سے اُن کا شغل یاد خدا، بیخودی ذکر اور الہیات تھا۔ (۲) انہیں ایام میں (دیکھئے آزاد مرحوم صفحہ ۲۲ و ۲۳) آپ ایک مرتبہ رائے بہادر پیارے لال صاحب سے ملنے آئے دو تین گھنٹے کے قریب

ملاقات رہی۔ وہ فرماتے ہیں کہ بار بار یہی الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے تھے۔ در رائے صاحب آپ اس شعر کو پڑھا کیجیے اس کے معنی آپ جو چاہیں سمجھ لیں سہ

پردہ درِ کعبہ سے اُٹھا دینا ہے آساں
(دیگر) پہ پردۂ رُخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

حالت جنوں میں اگر کبھی اُنھوں نے دو چار سطریں لکھ دی ہیں تو اُن میں کچھ اور ہی لطف ہے۔ دیوان ذوق کے چھپنے کے بعد جب ایک کاپی اُن کے پاس رکھی گئی اور خاتمہ لکھنے کی درخواست کی گئی تو کئی دن تک انکار کرتے رہے ایک دن خود ہی قلم دوات لے کر ایک صفحہ لکھ دیا جو دیوان ذوق کے خاتمہ پر درج ہے آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس میں اور حالت صحت کی تحریر میں کیا فرق ہے لیکن اس میں بھی تصوف اور الہیات کی بو آتی ہے۔

اس زمانہ کی تحریروں کو مولوی ممتاز علی صاحب مالک مطبع رفاہ عام لاہور نے چھپوا دیا ہے اور اس رسالہ کا نام سپاک و نماک رکھا ہے لالہ سری رام صاحب دہلوی مصنف خمخانہ جاوید لکھتے ہیں کہ "اس بگڑی ہوئی حالت میں بھی

جب کبھی قلم دوات کے نصیب کھل جاتے تو عجیب عجیب گل
افشانیاں کرتے تھے کہ اب کوئی ذی ہوش بھی ایسی گلکاریاں
نہیں دکھا سکتا اُن کے حال پر اس شعر کا مضمون صادق
آتا ہے ؎

اگر میں ہوش میں ہوتا تو پھر کیا جانے کیا ہوتا
فروغِ دیدۂ عالم ہیں یہ مدہوشیاں میری"

موت اور رونے والے

سُنا ہے کہ ایام جنون میں اور حالت بیخودی میں ایک روز
مولانا نے بہت سے مسودات کا پلندا اُٹھا لیا اور دریا برد کر آئے
آخر زندگی کے دن پورے ہو گئے اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء
مطابق ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ کو حضرت آزاد اس قیدِ ہستی سے
آزاد ہو گئے۔ جس طرح وینس کو بائرن کی آخری آرامگاہ
ہونے کا فخر حاصل ہے اسی طرح لاہور کو ان کی جائے مزار
ہونے کا اعزاز رہے گا"

مولانا کے رونے والے اب بھی ہندوستان کے گوشہ
گوشہ میں موجود ہیں مگر اکثر مصنفین ہند اور شعرائے اُردو کی

طرح ابھی تک اِن کی بھی کوئی مستقل حیات (Life) نہیں لکھی گئی۔ لوگوں نے جستہ جستہ حالات مضامین میں لکھے ہیں جو بعض کتابوں اور رسالوں میں مضامین کی حیثیت سے شامل ہیں۔ موجودہ رسالہ مولانا کی "مکمل حیات" یا مبسوط تنقید کا ذمہ دار نہیں ہے صرف جستہ جستہ حالات قلمبند کردئے گئے ہیں انکی ترتیب میں منطقی انداز کا پہلو رکھا گیا ہے۔ مکمل تصنیف کے لئے میں کسی طرح موزوں نہیں نہ مجھکو فرصت ہے نہ ایسی قابلیت ہے کیا عجب ہے کہ یہ مختصر سا ہدیہ نکتہ سنج، ناقدین اور محققین کے لئے دعوت عمل ہو سکے۔

آزاد اور شاعری

سنہ ۵۷ء سے پہلے کا کلام سوا اس کے جو صندوق سینہ میں محفوظ رہ گیا ہو سب کا سب ضایع ہو گیا۔ ۱۸۹۱ء کے بعد کا کلام بھی ہاتھ نہیں آیا کچھ نئی طرز کی نظمیں جو آپ کے ہونہار بیٹے محمد ابراہیم صاحب نے اکٹھا کرکے چھپوائی ہیں۔ اُن میں سے کچھ شعر غزل کے رنگ میں لکھے جاتے ہیں۔
عاقلاں را اشارہ کافیست۔ ؎

سنے گا دیکھنا رو رو کے آوازِ اک جہاں میری
تمھارے عشق کی ہے داستاں اور ہے زباں میری

سناؤں داستانِ عشق سب قلقل کے پردے میں
صُراحی کے دَہن میں کاٹ کر رکھدو زباں میری

تقاضا ہے گریباں کا کہ مجھ کو چاک کر ڈالو
تمنا ہے یہ دامن کی اُڑا دو دھجیاں میری

ان اشعار میں صفائے بیان، سادگی اور روانی ہے جو اُنکی شاعری کے خصوصیات میں ہیں ورنہ اور کوئی خاص بات نہیں اور نہ یہ رنگ مولانا کی شاعری کا اصلی رنگ ہے۔

طرزِ جدید

مئی ۱۸۷۴ء میں کرنیل ہالرائیڈ کی مدد سے انجمن پنجاب قائم کی گئی اور اُس کے ماتحت مشاعرہ کا سلسلہ قائم ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ بازارِ علم میں دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی شاعری سبک ہو چکی تھی۔ روپیہ کمانے کے لئے علوم مغربی کا حاصل کرنا لازم ہو گیا لوگ شاعری کو عیب سمجھنے لگے تھے۔

اس کیفیت کا اظہار مولانا کے اس فقرہ سے ہوتا ہے۔
"اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعض طبائع شعر سے متنفر پائے جاتے ہیں اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں"

حالات کے تقاضے سے مختلف زبانوں کی شاعری کا اندازہ کر کے، اور طبیعت کی جدت سے مجبور ہو کر انھوں نے اردو شاعری کے نئے طرز یا نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی پہلے خود کئی نظمیں لکھیں اور اعلیٰ درجے کے مضامین لکھے۔ حالی صاحب اپنی کتاب مجموعہ نظم حالی کے دیباچہ میں اس وقت کا فوٹو اس طور پر کھینچتے ہیں۔

"۱۸۷۴ء میں جب راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے"

اس مشاعرے میں مصرعہ طرح کے بجائے "برسات" "حُبِ وطن" "تعصب و انصاف" "نیکی" "علم" یا اسی طرح اور مطالب تجویز کر دیے جاتے تھے۔ بحور اور اصناف سخن کا اختیار شاعر کو پورا پورا باقی رہتا تھا۔

اس مشاعرے کی افتتاح و ایجاد میں مولانا آزاد نے بہت سرگرم حصہ لیا اور اس میں شک نہیں کہ اُس کا سہرا انھیں کے سر رہے گا۔ سب سے پہلے یہ خیال انھیں کے ذہن میں آیا۔ اور انھیں کی تحریکات اور مساعی سے عملی صورت میں ظاہر ہوا۔ ظاہر ہے کہ موجد خواہ کسی درجہ کا ہو ہمیشہ موجد ہی رہتا ہے جانسن اور ایڈیسن کے احسانات نثر و نظم انگریزی کے ہمیشہ رہیں گے اگرچہ اس کے بعد کارلائل رسکن، ملٹن، براوننگ وغیرہ ہزار ہا ادیب اور شاعر نہایت بلند مرتبت گذر گئے ہیں۔ کیشو اور پدماکر نے جو خدمات ہند ہندی کاویہ کے متعلق انجام دی ہیں۔ وہ والمیک، تلسی داس اور صدہا معزز شعرا کی معزز ترین خدمات کے سامنے کبھی سُبک نہ سمجھی جائے گی۔ یہ واقعہ ہے کہ امیر خسرو نے اُردو کا پہلا شعر موزوں کیا۔ قطب شاہ نے پہلا کلیات نظم اُردو میں مرتب کیا۔ بیجو باورے نے پہلا دھرپد ہندی

بولوں میں باندھا رودکی نے پہلا شعر فارسی کا کہا اسی طرح حضرت آزاد نے بھی پہلی نظم اردو میں نئی طرز کی لکھی۔

انکا اصلی مقصد یہ تھا کہ پامال اور پیش پا افتادہ اجنبی اور کثیر الاستعمال تشبیہات و استعارات سے بچیں، سادگی اور واقعہ نگاری مشکل نویسی اور مبالغہ آمیزی کی جگہ آجائے بہرحال اردو شاعری میں قومی اخلاقی نئی شاعری یا غزل نظموں کی داغ بیل آزاد ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔

دو تقریریں

ذیل میں مولانا کی دو تقریروں کے بعض اقتباسات دیئے جاتے ہیں جن سے ان کی مطمح نظر، معیار شاعری، مقصد انجمن اور انہماک پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلی تقریر جو انھوں نے ۱۸۶۷ء میں کی تھی اس کا مقصد نظم اور کلام موزوں پر خیالات کا اظہار تھا وہ چاہتے تھے کہ نئے طرز کا مشاعرہ قائم ہونے سے پہلے ملک کو اس کے قبول کرنے کے لئے تیار رکھیں جو بہت مشکل اور بہت بڑا وصف ہے۔ دوسری تقریر افتتاحیہ تھی جو انھوں نے مئی ۱۸۷۴ء میں نہایت جوش و خروش سے کی تھی۔ (۱)

"شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ نیچر کو گویا کر دے درختان یا در گل کو رواں کر دے۔ ماضی کو حال حال کو استقبال کر دے، دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان خاک کو طلا، اندھیرے کو اُجالا کر دے۔ روشن دلان اہل درد کے نزدیک طلوع اور غروب آفتاب اور انقلاب صبح و شام ہزاروں باغ نوبہار قدرت الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلان بے خبر کے نزدیک کارگاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن رات چکر میں چلا جاتا ہے اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فن شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ اسی طرح شاعروں کی بدزبانی اور بدخیالی سے شعر بھی تہمت کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہئے کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروش خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے۔ خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبہ شاعری کو پہونچتے جاتے ہیں۔ ابتدائی شعرگوئی حکما اور علمائے متجر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے"۔

فقرہ خط کشیدہ کے پہلے حصہ کی تائید ورڈس ورتھ کے نظریہ شاعری سے ہوتی ہے یعنی جو کلام عارضی جوش کا نتیجہ ہو وہ اصلی کلام نہیں یہی وجہ ہے کہ ورڈس ورتھ فوری مشاہدہ کے بعد وقتی جذبات کے ماتحت کچھ نہیں لکھتا تھا بلکہ جب وہ عارضی کیفیت دفع ہو جاتی تھی اور دماغ میں مشاہدہ کا صرف "جوہر" باقی رہتا تھا تو سنجیدہ خیالات اور علاوہ تصور سے دل میں ایک جوش پیدا ہوتا تھا اور نیچرل نظمیں اسی جوش کا نتیجہ ہوا کرتی تھیں یہی وجہ ہے کہ ورڈس ورتھ کے کلام میں غیر ضروری حصص بہت کم پائے جاتے ہیں......

فقرہ کا دوسرا ٹکڑا بھی بہت بلیغ ہے۔ ارسطو طبع انسانی میں ایک ایسے عنصر کا قائل ہے جسکو ہم آپ قدسیہ یا الہیہ کہ سکتے ہیں اور جسکو وہ DIVINE POWER کے نام سے یاد کرتا ہے نیکومیکین اتھکس میں کئی جگہ تذکرہ ہے۔ ملٹن ایسا شاعر بھی اس قوت قدسیہ کی مدد کا معترف تھا جس کے شواہد اس کے کلام سے مل سکتے ہیں۔

۲۔ "بیشک مبالغے کا زور تشبیہ اور استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیئے کہ جتنا نمک ہو نہ کہ تمام کھانا نمک ہو جائے ہمیں چاہیئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعداد تشبیہ اور اضافتوں سے

اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اور ہے ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جہاں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ ہار طرّے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منھ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔ [آگے چل کر یوں فرماتے ہیں]

اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا اور مضمون کا جوش وخروش اور لطائف وصنایع کے سامان تمہارے بزرگ اسقدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہوگئی ہے وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں۔ جس میں کچھ وصل کا لطف بہت سے حسرت وارمان۔ اس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار خزاں۔ فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے دور دور کے استعاروں میں ادا ہوتے ہیں کہ

عقل کام نہیں کرتی وہ اِسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اُنکے محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اُٹھا سکتے یعنی اگر کوئی واقعی سرگذشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں ــــــــ [اور آگے اس مضمون میں فرماتے ہیں]

اے میرے اہل وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا وجہ اُس کی یہ ہے کہ بسبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہونگے۔ کئی پرانی مورتیں باقی ہیں۔ وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ ہماری زبان ایک دن نظم سے بالکل محروم ہو جائے گی اور اُردو میں نظم کا چراغ گُل ہو جائے گا ــــــــ اے باقبال گداؤ! اے شاہ نشاں خاکسارو! تمہاری نیک نیتی اچھے وقت تمھیں لائی مگر افسوس کہ تمھاری شاعری نے بہت کم عمر پائی۔ قسمت نے تمھیں اچھے سامان اور اچھے قدردان دیئے جن کی بدولت جوہر طبعی اور جوش اصلی کو اپنے اور اپنے شوق کے پورا کرنے کا

سامان ملے۔ اب نہ وہ سامان ہوں گے نہ ویسے قدردان ہونگے
نہ کوئی اس شاخ کو ہرا دیکھ سکے گا نہ تم سے بڑھ کر اس میں پھل
پھول لگا سکے گا۔ ہاں تمھاری لکیروں کے فقیر تمھارے ہی ہجر و وصل
اور خط و خال کے مضمون سُنینگے۔ انھیں لفظوں کو اُلٹیں پلٹیں گے
اور تمھارے چبائے ہوئے نوالوں کو منہ میں پھراتے رہیں گے"
یہانتک تو حضرت آزاد کی نثر کا نمونہ اور شاعری کے متعلق خود
اُن کے خیالات اور تمناؤں کا ذکر تھا۔ اب چند شعر نو طرز مرصع
سے نقل کیئے ہوے ملاحظہ فرمائیے جنمیں شملہ کی سردیوں کی کیفیت
اس طرح بیان کی گئی ہے ؎

جاڑے کے مارے چلتے ہوے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے
دامان کوہسار ہیں سورج بھی لپیٹ کر
دبکا لحاف برف میں منہ کو لپیٹ کر
دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامن کہسار تھے سفید
سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں

طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہوا
درّہ یہ ہے کہ موت کا مُنہ ہے کھُلا ہوا

موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے لہک گئی
خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آرہیں
جو زیر و بم کے دور سے سُر ہیں ملا رہیں

ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہوگیا
لبریز نور سے طبق خاک ہوگیا
مُنہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا
گُلگوں نہ لہکے سامنے رنگ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی
چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گُلِ تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا

اور جھوم جھوم کر وہ رُخِ گُل کا چومنا

سبزی جو روئے خاک پر مخمل بچھا گئی

شبنم بھی آکے رات کو موتی لُٹا گئی

پانی وہ صاف صاف جو بل کھاکے جاتے تھے

پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے

آزاد اور تنقید

آزاد کی نظم و نثر پر بہت سے حضرات کی تنقیدیں ہیں جن میں سے اکثر صرف مدح و ثنا سے بھری ہوئی ہیں اور اکثر محض مذمت و نفرت سے مملو ہیں چونکہ یہ رسالہ عام پبلک کے لئے اور ابتدائی جماعت کے طلباء کے لئے مرتب ہو رہا ہے ۔ اس لئے مؤلف نثر و نظم کے نمونے دیکر اچھائی اور برائی کا فیصلہ خود پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہے اس لئے کہ

(۱) وہی رائے سب سے اچھی ہوتی ہے جو ناقدین کی مدد کے بغیر خود اصل تصانیف سے قائم کی جائے ۔

(۲) اس وقت تک کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی جبتک

کسی مصنف کی حیات و تصانیف کا مکمل مطالعہ نہ کیا جائے۔

(۳) ابتدائی منزلوں میں مدح و مذمت کی بھول بھلیاں میں نہ پڑنا چاہیئے ورنہ آزاد کے بعض جوشیلے مداح سراؤں کی تعریفیں دیکھ کر یہ خیال ہوگا کہ ادب اردو میں آزاد ایسا عالم، فاضل شاعر، خوش گو، خوش نویس، کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ دوسری طرف "آرگس" [ملاحظہ ہو نگار بابتہ مئی و جون ۱۹۲۹ء] کی سخت و درشت تحریروں کے ملاحظہ سے ایسا محسوس ہوگا کہ آزاد میں تمام زمانہ کی برائیاں ہی برائیاں ہیں ایک سرے سے کسی خوبی کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت ان دونوں کے خلاف ہے۔ آزاد میں بھی دنیا کے تمام بڑے بڑے آدمیوں کی طرح برائیاں اور اچھائیاں دونوں ہیں۔ اب رہا یہ کہ پلہ کس طرف کا بھاری ہے اس کے فیصلے کے لیے بجائے خود ایک مکمل و مبسوط کتاب کی ضرورت ہوگی اس سطحی اور مختصر رسالہ میں اس کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اور نہ اصولاً نکلنی چاہیئے۔ یہ تو محض حضرت آزاد کے تعارف کے لئے ہے۔

تصانیف

ذیل میں حضرت آزاد کی تصانیف کی مکمل فہرست دی جاتی ہے۔ جو اس وقت تک شایع ہو چکی ہیں اکبر منڈی لاہور سے مل سکتی ہیں۔ ان کے نواسے آغا محمد طاہر آزاد بک ڈپو کے منیجر ہیں۔ یہ فہرست اس لئے درج کیجاتی ہے کہ جو نمونے دئے گئے ہیں۔ وہ محض آزاد کی تصانیف کے دریا کے چند قطرے ہیں۔ مکمل آزاد اپنی مکمل تصانیف کے بغیر نہیں مل سکتے جن صاحبوں کو شوق ہو وہ کتابیں پڑھیں۔ کتابوں کے ساتھ جو فقرے لکھے جائیں گے ان سے تنقید مراد نہیں ہے بلکہ محض کتابوں کا تعارف مدنظر ہے۔

فہرست کے پہلے ایک بات عرض کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آزاد کی طرزِ تحریر کیسی ہے۔ آزاد کا مرتبۂ شاعر اور نثار کی حیثیت سے کیا ہے۔ اور آزاد کی تنقید اور تحقیق کا معیار کیا ہے۔ ان تمام مباحث سے یہ رسالہ خالی ہوگا جس کے وجوہ پہلے عرض کئے جا چکے ہیں ہر طور پر ہم آزاد کی تصانیف کو ادبی نقطہ نگاہ سے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) جو ابتدائی درجوں کے لئے درس و تدریس کی خاطر مخصوص ہیں۔

(۲) جو موصوف کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

(۳) جو خلل دماغ کے زمانہ کا سرمایہ ہیں۔

زمانہ کے لحاظ سے بھی نظم و نثر کے علاوہ موصوف کی تصانیف دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں ایک وہ جو ان کے زمانہ حیات میں چھپ چکی ہیں اور دوسری وہ جو انکی حیات کے بعد طبع ہوئیں اس کا حال مختصر نوٹ میں دکھا دیا جائے گا۔

مولانا کی قدر ان کے معاصرین شبلی، سرور، سرسید، نذیر احمد، ذکاء اللہ، حالی، آشوب، وغیرہ کی نگاہ میں شاعر و نثار دونوں کی حیثیت سے بہت زیادہ تھی جسمیں مولانا کی تقریر کی انشاء پردازی بھی حصہ رکھتی تھی۔ شبلی صاحب نے تو جوش محبت سے بے چین ہوکر آزاد کو مجدد شاعر اور ادیب کے ساتھ "خدائے اردو" کہدیا ہے۔ کچھ بھی ہو آزاد ناخدائے اردو ضرور ہیں۔

(۱)

پہلی صنف کی کتابیں حسب ذیل ہیں

(۱) فارسی کی پہلی
(۲) " " دوسری
(۳) جامع القواعد ..... اعلیٰ مدارج کیلئے
(۴) اُردو کا قاعدہ
(۵) اُردو کی پہلی
(۶) " " دوسری
(۷) " " تیسری
(۸) " " چوتھی
(۹) قصص ہند حصہ دوئم

اِن کتابوں کی مشترک خوبیاں یہ ہیں۔

(۱) زبان نہایت سادہ مطالب آسان اور طرزِ تحریر دلچسپ ہے

(۲) سادگی اور دلچسپی برابر بڑھتی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ بچے آسانی اور شوق کی وجہ سے اُستاد کی مدد کے بغیر بھی آگے کا سبق پڑھ کر سمجھ لیتے ہیں اور تیار کر لیتے ہیں۔

(۳) اُردو کی تعلیم کے لیے آزاد کی ان کتابوں کے پہلے طلباء کے لایق ایسی مرتب آسان اور دلکش کتابیں نہ تھیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی اُردو کی پہلی دوسری تیسری چوتھی پانچویں کتابیں بہت بعد لکھی گئی ہیں۔

ان کتابوں کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے ان سب کو منظور کر لیا اور آج تک بعض کتابیں داخل نصاب ہیں۔

(۲)

(۱) آبحیات ۔ مشاہیر شعرائے اُردو کے سوانح عمری اور زبان اُردو کی عہد بعہد

ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان ہے۔ زبان صاف اور سادہ طرز ادا دلچسپ ہے۔ کئی بار چھپ چکی ہے۔ دس بارہ ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔

دیوان ذوق ۔ جس میں ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کا کلام اُستاد کے قلمی مسودوں، اپنی مختلف بیاضوں اور یادداشتوں سے جمع کیا۔ سوانح عمری شروع کتاب میں ہے اور اکثر غزلیات و قصائد کے متعلق دلچسپ نوٹ مولانا آزاد نے خود لکھے ہیں ۔ ایک بار کوہ نور کے اڈیٹر سے آزاد نے کہا کہ "میں نے اس دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی ہے الزام یہ ہے کہ میں خود غزلیں کہہ کر اُستاد کے نام سے شایع کرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو خود اپنے نام سے شایع کرتا"

(۱۱) **نظم آزاد** ۔ پروفیسر آزاد کی چند معرکتہ الآرا مثنویوں اور نظموں کا مجموعہ ہے ۔ جو لاہور کشا سبھا انجمن پنجاب اور دیگر مشاعروں میں پڑھی گئیں اس کے علاوہ غزلیات، قصائد، اشعار، رباعیات وغیرہ بھی شامل ہیں۔

(۱۲) **نیرنگ خیال** ۔ رنگین بیانی کا ایک دلفریب مرقع ہے استعارہ اور تمثیل سے اخلاقی مدنی اور تاریخی تصویریں کھینچی گئی ہیں دنیا کی ابتدائی حالت سچ اور جھوٹ کا ازمیانہ شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار اور اسی طرح کے سب سے نازک مطالب بہت دلچسپ اور عام فہم انداز سے بحث کی گئی ہے۔

(۱۳) **دربار اکبری** ۔ جلال الدین اکبر شاہنشاہ ہندوستان اور اس کے امرائے جلیل القدر کے دلچسپ حالات درج ہیں ۔ یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں مطبع رفاہ عام کے مالک و

ناظم منشی سید ممتاز علی نے چھپوائی ہے۔ اس وقت اس کی ضخامت صرف ۱۲۸ صفحات کی تھی دوسری مرتبہ محمد ابراہیم صاحب نے اصل مسودہ کی مدد سے شایع کی جس کا حجم اکیار گی ۱۲۸ سے بڑھکر ۲۴۸ صفحات تک پہونچ گیا۔

(۱۴) **نصیحت کا کرن پھول** ۔ یہ کتاب لڑکوں کی تعلیم کی نسبت ایک میاں بیوی کی دلچسپ بحث ہے اور اس قابل ہے کہ آویزۂ گوش بنائی جائے ۔

(۱۵) **سخندان فارس** ۔ زبان فارسی کی مکمل تاریخ ہے۔ اس کی تدوین و ترتیب میں آزاد نے بہت وقت و محنت صرف کیا ہے مختلف زبانوں کے مقابلہ سے نمونوں کے باہمی رشتوں کے مٹے ہوئے مرقع صفحات پر کھینچ دئے ہیں۔ ژند پہلوی دری اور سنسکرت کے الفاظ کے مقابلہ سے تاریخی نتائج نکالے ہیں سیاحت ایران کے دلچسپ حالات بھی موقعہ موقعہ سے درج کئے گئے ہیں ۔

(۱۶) **قند پارسی** ۔ اہل زبان سے مفید بات چیت جو آزاد نے اپنے دو مرتبہ کے سفر ایران میں کی ہیں اُن کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔

(۱۷) **مکاشفات آزاد** ۔ } یہ دونوں کتابیں جنون و بیخودی کی حالت میں لکھی گئی ہیں
(۱۸) **رسالہ سیاک نمک** ۔ } کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد آزاد نے کچھ نہیں لکھا ۔
نفسیات کے مطالعہ کرنیوالے کہتے ہیں دلچسپ ہے۔

(۱۹) **ڈرامہ اکبر** ۔ جہانگیر و نور جہاں کے حسن و عشق کی کہانی ہے[۳] ۔

(۲۰) **لغات آزاد** ۔ حضرت آزاد کے خاص لغات کا مجموعہ ہے ۔

(۲۱) **بیاض آزاد** ۔ حضرت آزاد نے عنفوان شباب میں شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب کیا تھا ۔

(۳) یہ کتابیں آزاد مرحوم کے نواسے محمد طاہر صاحب نے حال میں شایع کی ہیں

گذارش

اس مختصر رسالہ کے مقاصد پچھلے صفحات میں ظاہر کر دیے گئے ہیں جن کا دوہرانا فضول ہے اس کی ترتیب میں خاص خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

۱۔ غیر ضروری حالات درج نہ ہوں۔

۲۔ قابل بحث باتوں سے پرہیز کیا جائے۔

۳۔ زبان آسان الفاظ سادہ اور تحریر رواں ہو۔

۴۔ موصوف کی نظم و نثر کا اندازہ خود انھیں کے فقروں اور شعروں سے ہو سکے تاکہ پڑھنے والا ناقدین کی نگاہ سے نہ دیکھے۔

۵۔ حالات و مطالب کی ترتیب منطقی طور پر رہے۔

جن مضامین سے مجھے خاص طور پر مدد ملی ہے وہ حسب ذیل ہیں

(الف) حضرت آزاد۔ ہمارے لائق لکچرار اردو الہ آباد یونیورسٹی سید محمد حفیظ صاحب نے انگریزی اور اردو کے بہت سے مضامین سے مولانا کے حالات بڑی کوشش سے جمع کئے ہیں۔

(ب) "آزاد مرحوم" ایڈیٹر صاحب صوفی نے سوانح اور تنقید میں ایک [illegible] کی صورت میں شایع کی ہیں۔

(ج) تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ صاحب نے انگریزی میں لکھی۔ جسمیں آزاد پر شاعر و ناظم کی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ **مؤلف**

نیشنل پریس الہ آباد میں باہتمام منشی رمضان علی شاہ چھپی